یہاں دنیا میں تشریف لے آئے۔ خالہ کی
تو خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ خوش تو گھنے میاں کے پاپا اور
چاچو بھی بہت تھے۔ چاچو کی تو انہیں پہلے ہی سے فکر لاحق ہوئی
تھی کہ منتظر رب ان کے سہرے کے پھول بھی کھلنے کو
تھے اس گھنے میاں کا انتظار تھا کہ وہ بھی دنیا میں
آ جائیں اور چاچو کی شادی میں شریک ہو لیں۔

"چلو بھئی اسپتال سے جلدی چھٹی کروا دو...... گھر
چلو...... یہاں تو نہ جانے کیسے کیسے لوگ آتے ہیں اور
بچے کو ہاتھ لگاتے ہیں...... کہیں جراثیم لگ گئے اور بچہ
بیمار پڑ گیا تو......" خالہ دوسرے ہی دن لوگوں کے آنے
جانے سے چڑ ہو کے بولیں اور وہاں سے گھر جانے کی
گھنٹیاں بجنے لگیں...... یہ ٹھیک تھا کہ خالہ کافی وہمی
تھیں مگر ہم بھی اگر یہ مسئلہ ہو کر آیا تو بھلا ہم کیا کر
لیں گے اور اب تو ان کے پاس مضبوط جواز بھی ہو گا۔ وہ
ننھے "میاں جیٹھو" سے بچانے کی ہر ممکن کوشش پہلے سے
شروع کر چکی ہیں......؟

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما ویسے بھی ہماری
شادی کی سالگرہ ہے نبا کا گھر پر ہونا تو بہت ضروری
ہے۔" میاں صاحب نے شوخ نظروں سے ہماری
جانب دیکھا۔

"ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم سے یاسر جلدی
کرو اور گھر چلو۔" وہ ضد کر بولیں۔

"ہو سکتا ہے کل تک چھٹی ہو جائے۔" یاسر نے
کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابھی کل نہیں...... آج ہی...... نہ معلوم
یہاں کون کون سے مختلف جراثیم موجود ہوں گے۔ تم
نے سنا نہیں کل اس اسپتال کی نرس کیا کہہ رہی تھی......"
وہ پریشان کن لہجے میں بولیں۔

"کیا کہہ رہی تھی......؟" یاسر بھی پریشان ہو
گئے۔

"کہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ جلدی چھٹی کروا لیں......
اسپتال میں تو اتنے مریض ہوتے ہیں اور بے شمار اقسام
کے جراثیم بھی پھیلے ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچوں پر تو فوراً
اٹیک ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اب ہمیشہ کئی قسم کے
جراثیم بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں جن کا کوئی ریکارڈ ہی
نہیں ہے کوئی کہتا ہے کہ امریکہ ہمارا انہیں پر تجربات کر کر
کے نت نئے جراثیم دنیا میں پھیلا رہا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ
کئی اقسام کے جراثیم مریخ سے زمین پر وارد ہو رہے ہیں......
اے مولا......! اب ان کا کیا کریں جو کم بخت نہ نظر آتے
ہیں نہ ان پر کوئی اینٹی بائیوٹک اثر کرے۔" خالہ بی
ہول کے بولیں۔

"خالہ پریشان نہ ہوں...... ان کو ان کے حال پر
چھوڑ دیں۔" ہم نے انہیں دلاسا دیا۔ وہ حیران ہو کے
ہمیں دیکھنے لگیں۔

"خالہ کچھ باتیں صرف اللہ پر چھوڑنے والی ہوتی
ہیں۔ یہ ننھے ہم دو کا بچہ ہے...... ننھے دور کے ہر چیلنج کا
مقابلہ کرنے کی طاقت اسے اللہ ضرور دے گا۔" ہم
مسکرائے۔

خالہ بی کے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ
آ گئی اور صاحب بہادر تو بڑی ہی اپنے ولی عہد کی طرف
رہے تھے جس کے چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ کے
ساتھ امید کی چمک بھی تھی۔ ہر گزرتا لمحہ، ہر دن اور ہر
سال کا آغاز ایک نئی امید کی نوید تو دیتے ہی ہیں اور ہر
نئی زندگی بھی اس چیز کی نوید ہوتی ہے کہ خدا ابھی اپنے
بندوں سے مایوس نہیں ہوا...... اور ساتھ یہ بھی کہ جس
ہستی نے نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں اس وجود کی
حفاظت کی ہے جہاں تک رسائی کے لیے خود ماں بھی
بے بس ہوتی ہے۔ دنیا میں لانے کے بعد بھی اس کو
دینے والا وہی ہے...... کہ سب کچھ اسی کی مرضی کے تابع
ہے بات تو صرف سمجھنے کی ہے۔

ابلیس

نمرہ احمد

یہ کہانی جو میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں، یہ
میری کہانی نہیں ہے بلکہ میں تو صرف اس کہانی کی
ایک خاموش تماشائی ہوں۔ میرا اصلی حلیہ اور کردار تو
اس داستان کے کسی پڑھنے والے کے لیے شاید یاد
رکھنے کے قابل نہ ہو مگر ان دو کرداروں کا ضرور
ہو گا جنہیں میں ان کے خوب صورت ناموں سے
جانتی ہوں۔

فروا ابراہیم اور رضا حیات خان۔

میں نے ان دونوں کو بہت قریب سے دیکھا
ہے اور ایسے دیکھا ہے جیسے کسی نے نہ دیکھا ہو گا اسی
لیے آج میں ایک بات کہنے کے قابل ہوئی ہوں۔ وہ
بات جس کو میں ہمیشہ جھٹلاتی تھی کہ شک کا فائدہ ہر

ایک کو نہیں دینا چاہیے۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب وہ حد پار کر لی جائے تو اس اصل استحقین کو شک کا فائدہ نہیں دینا چاہیے۔ اصولوں پر سمجھوتے نہیں کیا کرتے اور جو یہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بہت غلط کرتے ہیں۔

ہماری یہ کہانی قریباً سال بھر پہلے سے شروع ہوئی تھی جب میں اپنے ماسٹرز کے پہلے روز سائیکالوجی کی کلاس لینے گئی تھی۔

☆☆☆

میں نے زندگی میں کبھی اتنا پُرکشش اور پُرسکون شخص نہیں دیکھا تھا جو اس روز کلاس میں پڑھا رہا تھا۔ گو میں کمزور دل اس شخص کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئی تھی جو ہمارے سائیکالوجی کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر۔۔۔ وہ وہ نہیں لگتے تھے۔ میں بھی اس سحر زدہ ہوئی اکثریت کے ساتھ تھی اور ان سب کی طرح میں بھی کچھ نہیں کہہ پا رہی تھی۔ تو نہیں پلٹنے کا ہوش ہی کسے تھا۔ وہ تھے ہی ایسے شخص کہ جن کے سامنے نگاہ ٹھہرتی نہ تھی۔

وہ روسٹرم پر کھڑے اپنے سنجیدہ انداز میں لیکچر دے رہے تھے۔ تیکھے نقوش، خوب صورت آنکھیں، صاف رنگت، جیل سے پیچھے کیے بال، نفیس اور دلکش گرے تھری پیس میں ملبوس وہ بلا کے وجیہہ تھے۔ صرف وجاہت نہیں ایک اور کشش بھی ان کے اندر تھی جو مقابل کو اپنی حد سے گزر جانے دیتی تھی۔ وہ کشش کیا تھی، میں اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ بس کوئی ہالہ جیسا اثر تھا جو ان کے گرد پھیلا تھا اور اس ہالہ طبیعت سے کوئی بھی گفتگو نہیں رہا تھا۔ کلاس ختم ہوئی تو سب کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ سر رضا حیات خان۔

اس روز مجھے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کا نام معلوم ہوا تھا۔ وہ ینگ تھے، اسمارٹ تھے اور ان کی حسِ مزاح بہت زبردست تھی۔ ان کے لیکچر میں کوئی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ ان کی شخصیت کا فسوں تھا اور کچھ کمال کا تھا۔ وہ اپنے موضوع پر مکمل عبور رکھتے تھے اور وہ کبھی لاجواب نہیں ہوتے تھے۔ ان سے پوچھے جانے والے ہر سوال کا جواب سائل کو ہمیشہ بروقت ملتا تھا۔ عمر میں وہ زیادہ نہ تھے۔ ایم فل کیے ہوئے بھی انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور یونیورسٹی سے وہ پانچ برس سے منسلک تھے۔ ہم تو ان کے پرستار بن ہی گئے۔ ہمارے سینئرز کا تو اور برا حال تھا۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اگر کسی کا چرچا تھا تو وہ سر رضا تھے۔

ان سے میرا باقاعدہ تعارف ان کی دوسری کلاس میں ہوا جب انہوں نے تمام طلبا سے اپنا نام بتانے کی درخواست کی۔ جب میری باری آئی تو میں قدرے جھجک کر کھڑی ہوئی۔ "سر میرا نام علیمہ داؤد ہے۔"

انہوں نے جواباً مجھے ہلکی نرم سی مسکراہٹ دی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ واپس نشست پر بیٹھی۔ ان کی وہ مسکراہٹ میری متاعِ جاں بن گئی۔ وہ میرے لیے مسکرائے، میرا نام سن کر مسکرائے۔۔۔ مجھے لگتا تھا میں کبھی اس لمحے سے نکل نہیں سکوں گی۔ مگر میرا دل۔۔۔ ابھی اور بہت سے لمحے آنے تھے۔

☆☆☆

اس روز باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی اور اندر ہماری کلاس جاری تھی۔ آج وہ سائیکالوجی سے ہٹ کر بات کرنے کے موڈ میں تھے اور ہم سحر زدگی کے عالم میں ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

"کون بتائے گا کہ انسان کی شناخت کس چیز سے ہوتی ہے؟" وہ چہرہ قدرے جھکا کر مائیک میں بولے تو بہت سے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔

"انسان کی شناخت اس کے نام سے ہوتی ہے سر۔"

"اس کے ملک سے۔"

"قبیلے یا ذات سے۔"

"رسم و رواج سے۔"

"زبان سے۔"

"اس کے کردار کی خصوصیات سے۔"

"کسی اچھے یا برے کام سے۔"

وہ مسکرا کر ایک ایک کی سنتے گئے۔ دفعتاً میں نے اپنا کمزور سا ہاتھ بلند کیا جانے اتنے لوگوں میں انہیں میرا ہاتھ کہاں سے نظر آ گیا۔

"مس علیمہ داؤد۔۔۔ آپ بتائیں، انسان کی اصل شناخت کس شے سے ہوتی ہے؟" بہت سی گردنیں میری جانب گھومیں۔ میں نے بمشکل تھوک نگلا۔ سب کے سامنے بولنا میرے لیے ہمیشہ مشکل رہا تھا مگر پروفیسر رضا کی ہمت افزا مسکراہٹ میرے اندر گویا روح پھونک گئی۔

"دین سے۔" میں ہکلا کر بولی تو ان کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

"کاش علیمہ نے وہ بات کی ہے جس کے سننے کو میں منتظر تھا۔ ہم شناخت کے معاملے میں دین کو کیسے سکپ کر سکتے ہیں؟ دراصل یہ مشکل سا نکتہ کا ایک اہم سوال ہے کہ جب ہم انسانی شناخت کی بات کرتے ہیں تو دین کو کیوں بھلا دیتے ہیں؟" وہ اپنے مخصوص پُرکشش انداز میں ہاتھ ہلا کر کہہ رہے تھے اور میں بس ان کے ایک ایک لفظ پر ہی ٹھہر گئی۔

"کاش علیمہ نے وہ بات کی ہے جس کے سننے کو میں منتظر تھا۔" باہر گرتی بارش کے قطرے میرے دل پر گرنے لگے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا میں ابھی رو دوں گی۔

میں وہ بھی سب سے ہجوم تو کیا دو لوگوں میں بھی کھڑی ہوں تو کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ چہرے پر پاؤڈر پہنے، گرے حاشیے والی چادر اوڑھے، میں بے حد معمولی شکل کی لڑکی تھی۔۔۔ اگر کوئی میری موجودگی کو نوٹ کرتا بھی تھا تو شاید میری۔۔۔ بیساکھی کے باعث جس کے سہارے میں چلتی تھی۔ ایک حادثے میں کئی برس قبل میری دائیں ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی اور اب میرا واحد سہارا میری بیساکھی تھی۔ ایک کم شکل معذور لڑکی کو کسی نے کیا گھر تک ہی لانا ہوتا ہے تو واقعہ تھا۔ میں خود کو یادوں میں تیرتا محسوس کرنے لگی تھی۔

شام کو جب میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تو خود سے باتیں کرنے لگی۔ ہر شخص خود کلامی کرتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ وہ خود کلامی نہیں کرتا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ تنہائی میں، میں نے بھی اپنی ایک دنیا بسا رکھی تھی۔ جہاں میں معذور اور کم شکل نہ تھی۔ جہاں میری ٹانگ اور نہ کیل نہیں ہوتی تھی اور جہاں مجھے کوئی احساس کمتری نہیں ہوتا تھا۔ وہاں اس دنیا میں، میں علیمہ داؤد نہیں تھی۔ میں ایمانا دور تھی۔ یہ نام بھی خود کو میں نے ہی دیا تھا۔ یہ نام مجھے بہت پسند تھا۔ اپنا نام بدلنے کا اختیار نہ تھا۔ مجھے اگر ہوتا تو بھی علیمہ داؤد کے ساتھ میرا وجود بھی ان نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور میں خود کو بھی ایمانا نام دیتی۔

ایمانا بہت خوب صورت تھی۔ یہ تو تھا شاہ عمیر اور شاہی خاندان کی اکلوتی اولاد۔ باپ کے اربوں کے بزنس کی اکلوتی جانشین اور یونیورسٹی کے ہر اسٹوڈنٹ کے دل کی دھڑکن ہونے کا سبب۔ وہ جب چلتی تھی تو لوگ ٹھہر ٹھہر کر اسے دیکھتے تھے۔ اس کے حسن، ذہانت اور دولت کے قصے ہر جگہ پھیلے تھے۔ وہ راجہ حالی کی شہزادی تھی اور اس جیسا کوئی نہ تھا۔

اماں کی آواز آئی تو میں چونکی پھر بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی باہر آئی۔ اماں کی آواز یونہی اکثر میرے اردگرد تیرتے "ایمانا دور" کے سحر کو پلٹنے میں مدد کرتے چھوڑ دیا کرتی تھی۔

"جی اماں!" میں نے کچن کے کھلے دروازے

سے جھانکا تھا۔ وہ ہنگ کے سامنے کھڑی
ورق دھورہی تھیں۔ آواز پر پلٹیں۔
"تمہارے ماموں آئے تھے آج پھر کرایہ کا تقاضا کررہے تھے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔" ان کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے اس کا کرایہ باقاعدگی سے ماموں کو ادا کرتے تھے کہ نانا کی ملکیت تھا اور ان کے بعد اب ماموں اس کے مالک تھے۔ اماں کی بیوگی کے آغاز کے چند برسوں میں جب میں بہت چھوٹی تھی، ماموں نے از راہ ہمدردی ہمیں اس گھر میں مفت رہنے دیا تھا۔ (جب وہ خود بھی زیر تعلیم تھے۔ ایف ایس سی والے سے گھر میں شفٹ ہوئے تو انہیں دو، تین برس ہی ہوئے تھے یعنی اماں وہ دم سے کرایہ وصول کرنے لگے اور اب وہ ان چند ماہ اماں کی صحت و رہائش کا کرایہ بھی کسی رنگ وقت کے بہانے پر طلب کررہے تھے۔ اماں کی چھوڑی دو دکانوں کے کرایے سے ہمارے گھر کا خرچ، دکان کا کرایہ اور میری تعلیم کے اخراجات بہ مشکل پورے ہوتے تھے۔ اب یہ اضافی خرچ کہاں سے لاتے؟

کوئی اور دن ہوتا تو میں اماں کو تسلی دیتی مگر آج میں خود بھی خاموش ہوگئی۔ شاید میں ذہنی طور پر اماں کے پاس نہیں تھی بلکہ ابھی تک کلاس روم میں تھی۔ جہاں بارش کے قطرے گرتے قطرے بند کھڑکیوں کے شیشوں پر ٹپک رہے تھے۔ اماں کافی دیر اپنے مسائل کا رونا روتی رہیں مگر جب میں خاموشی سے خلا میں گھورتی رہی تو وہ شکست خوردہ سی اپنے کاموں کی جانب پلٹ گئیں۔

اگلے روز میں کلاس کے بعد لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب مجھے سامنے کھڑے بک ریک کے پیچھے سے مدھم سی آوازیں سنائی دیں۔ لاشعوری طور میں ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔ وہ کسی اور کی نہیں بلکہ پروفیسر رضا کی ہی آواز تھی۔

"آپ روئیں مت، آپ پریشان ہوجائے گا۔ میں کہہ رہا ہوں نا کہ ہوجائے گا۔" میں نے گردن ذرا سی ترچھی کی۔ وہ بک ریک کے عقب میں کھڑے ہاتھ اٹھا کر کسی کو تسلی دے رہے تھے۔

"مگر آپ پریشان نہیں ہوسکے گا۔ ڈاکٹر نے آج کی آخری تاریخ دی تھی۔ میری بہن مرجائے گی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" وہ رندھی آواز میں بولتا ہوا تھا۔ میں اکلوتی لفظوں میں نے سنا تھا اس کی بہن کی کوئی سرجری ہونی ہے۔ ابھی وقت ہی نہیں ملا کہ مزید تفصیل پوچھتی۔ ویسے بھی میں ان شریف لڑکیوں میں سے تھی جو لڑکوں سے مخاطب نہیں ہوا کرتی تھیں۔

"اچھا روم نمبر کیا ہے اس کا؟" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے اپنے ازلی نرم انداز میں پوچھ رہے تھے۔ اس نے روم نمبر بتایا اور سر جھکائے آنسو کو کنارہ انگلی کی نوک سے پونچھا۔ میں نے دیکھا، پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ میں دھیرے سے سر جھٹک کر پڑھنے لگی مگر اب کتاب کی طرف ذہن کہاں متوجہ ہوتا تھا۔

بہ مشکل تین دن گزرے تھے کہ مجھے وہ لڑکا کیمپس میں ایک جگہ بینچ پر بیٹھا نظر آیا۔ ساتھ اس کے دو تین دوست بھی تھے۔ اور وہ کسی بات پر ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ مجھے ذرا اچنبھا ہوا مگر خیر... میں سر جھکائے، ویسے ہی سے خود کو گھسیٹتی ان کے قریب سے گزر رہی تھی جب اس کے دوست کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"بہت مبارک ہو یار۔ میں گھر پر آنٹی کو مبارکباد دینے بھی آؤں گا۔"

"ہاں یار! میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا پرسکون ہوں۔" اس کے چہرے پر بڑی خوشی بکھری تھی۔

"مگر یار، یہ کیسے ہوگیا؟ آپریشن کی پے منٹ کس نے کی تھی؟"

"نہیں... مگر وہ جو بھی تھا، فرشتہ تھا میرے لیے۔ اللہ اسے اجر دے۔" اور ان سے وہ دور جاتے ہوئے میرے لبوں سے بے اختیار نکلا "آمین۔" اور میں جانتی تھی کہ وہ کون تھے۔

☆☆☆

یہ بدلتے موسم کا اثر تھا اور کچھ میری نازک طبیعت، مجھے اچانک نزلہ زکام نے گھیر لیا۔ میں تین روز تک یونیورسٹی نہ جاسکی۔ چوتھے روز جب کلاس میں گئی تو بھی زکام کی باقیات باقی تھیں۔ لیکچر کے اختتام پر جب میں کلاس سے نکلی تو رضا حیات خان کاریڈور میں ہی کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے اس پر رشک آیا جس کے انتظار میں وہ تھے۔ ان لمحوں کے انتظار نے اس معصوم شخص کو کتنا معتبر کردیا تھا۔

"علیزہ داؤد... کدھر تھیں آپ؟ میں آپ کا ہی انتظار کررہا تھا۔" میں ان کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ مسکرا کر میری طرف بڑھے۔ میں ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ میرا انتظار کررہے تھے؟

"جج... جی پروفیسر؟" میں سانس روکے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ میرے بالکل سامنے آرکے۔ ان کے شانوں اور وجود سے کسی قیمتی پرفیوم کی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔

"تین دن کدھر غائب رہیں؟ میں تو پریشان ہی ہوگیا تھا۔"

"م... میں ذرا... وہ نزلہ ہوگیا تھا۔"

"اوہ... اپنا خیال رکھا کرو۔ اسٹوڈنٹ کو بیمار نہیں پڑنا چاہیے اور وہ بھی برائٹ اسٹوڈنٹ کو تو ہرگز نہیں۔" وہ مسکرا کر مجھے لہجے میں کہہ کر پلٹ گئے... اور میں علیزہ داؤد اپنے سست رو لمحے میں مقید فضا میں بیٹھنے لگی...

اور میں کہتا تھا کہ وہ فرشتہ ہے۔ مجھے لگتا تھا وہ کوئی پری ہے جو آسمانوں سے اترا ہے مگر شاید وہ اس سب سے بڑھ کر کچھ اور تھے۔ وہ ساحر تھے ان کے ایک اشارے پر دل کھلتے، سیاں ساحب بن جایا کرتی تھیں اور مجھے کہاں آتے تھے؟

ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ دنیا میرے پہلے کے آس پاس کہیں تحلیل ہوگئی ہے۔ سب ختم ہوچکا ہے اور

پاکیزہ سالگرہ مبارک

تیرے یوم ولادت پہ
میری مسکان کہتی ہے
تجھے ایسی بہت سی اور بھی خوشیاں مبارک ہوں
تیرے سب سے انمول پل
لکھا ہے "پاکیزہ"
میں سوچتی ہوں تو پھر میرا
دل یہ کہتا ہے
تیرے ساتھ رہ کے مجھے
لمحے خوشی کے ملتے ہیں
تیری خوشبو میں تیرے لیے
میرے سب سے انمول احساسات کو محسوس کرتے ہیں
تیرے ساتھ ہی افسانے
میں سوچتی ہوں تو پھر خود کو
تیری دنیا میں پاتی ہوں
اور دعا ہے تیرا ہر پل یونہی ہنستا رہے
میری جانب سے تجھ کو
تیرے سالگرہ کا دن
تجھے ہر ایک لمحہ
سعادت مند رہے
دل سے مبارک ہو
شاعرہ: سیدہ ... شاہ، بہاولپور، پنجاب

اگر کچھ باقی ہے تو میرا انتظار ـــــ ہر روز رضا حیات خان کی کلاس کا انتظار۔

انہیں ایک نظر دیکھنے، ان کی ایک مسکراہٹ حاصل کرنے کا انتظار اور پھر کلاس کے اختتام کے بعد اگلے روز کلاس کا انتظار شروع ـــــ کبھی وہ مجھے دیکھتے، کبھی مسکرا بھی دیتے اور کبھی وہ اپنے لیکچر کو سمجھانے میں اتنے مصروف ہوتے کہ انہیں میں دکھائی نہ دیتی۔ وہ دن میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ جب ان کی نگاہ میری جانب نہ اٹھتی۔ اس دن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں عجیب ڈپریشن کی لپیٹ میں رہتی۔

وہ دسمبر کا ایک سرد دن تھا جب میں اماں کے ساتھ کسی کام سے شاپنگ سینٹر آئی۔ دکانوں کے سامنے سڑک پر خاصا رش تھا اور ہجوم جگہوں پر مجھے یوں خوف آتا تھا۔ میں اپنی اماں ہی کے سہارے خود کو سنبھالتے ہاتھ پکڑے چلی جا رہی تھی جب مجھے سڑک کے دوسری جانب ایک منظر دکھائی دیا۔

ایک جھلک، ایک گمان ـــــ میں چونکی۔ وہ بلاشبہ رضا حیات ہی تھے۔ اپنے مخصوص حلیے سے ہٹ کر وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے سفید اسٹک پکڑے دیکھنے پر نابینا لگتا تھا ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے رضا کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ رضا اثبات میں سر ہلاتے اسے بغور سن رہے تھے پھر وہ اس عمر رسیدہ شخص کا ہاتھ تھام کر آگے آئے اور احتیاط سے دو طرفہ بہتی ٹریفک کے درمیان سے گزرتے اسے سڑک پار کرانے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں سڑک کے اس طرف پہنچ گئے۔ بوڑھے کو نرمی سے کچھ سمجھا کر اب وہ جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ شخص دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں دعا دینے لگا۔ رضا بہت ممنون، بہت شرمندہ سے واپس پلٹے۔ میری نگاہوں نے اس وقت تک ان کا تعاقب کیا جب تک کہ وہ واپس اپنی کار میں نہ بیٹھ گئے۔ پھر میں مسکرا کر ہولے سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

کہاں ہوتے ہیں آج کل ایسے لوگ؟

☆☆☆

"شک کا فائدہ ہر ایک کو دینا چاہیے۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟" کلاس میں سکوت چھایا تھا اور وہ اپنے ازلی سحر انگیز انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ہر ذی نفس خاموش۔ سارے جیسے ان کو ان سے اختلاف نہیں تھا سوائے میرے۔

"میں ہوں۔" میں نے اپنا کمزور ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ وہ ذرا چونکے شاید حیران ہوئے تھے۔

"علیمہ داؤد" وہ مجھے یاد کر کے بولے۔ "ہماری سب سے پیاری اسٹوڈنٹ اس بات سے کیوں متفق ہیں ہمیں بتا سکیں پلیز؟"

یہ مبالغہ آرائی تھی۔ میں بہت ایوریج سی طالبہ تھی اور یہ بات سب جانتے تھے معلوم نہیں وہ کیوں مجھے اتنی اہمیت دیتے تھے۔ یا پھر وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے لگا میں بھی وہی دیکھ رہی ہوں۔

"میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو شک کا فائدہ دیا جانا چاہیے اگر آپ نے کچھ آنکھوں سے دیکھا یا نہیں دیکھا تو بھی جانے کسی کو ذرا سے دو الزام ٹھہرانے کے اسے شک کا فائدہ دے کر بری الذمہ قرار دے دینا چاہیے۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے علیمہ کہ آپ کا پیار کن جگہوں پر اپلائی ہوتا ہے؟" ہال میں خاموشی چھائی تھی اور وہ اس پہ کہاں رکے پوری توجہ سے میری جانب متوجہ تھے۔ اور وہ تو ایسا ہی [illegible] تھے۔

"ہر اس جگہ پہ جہاں کسی انسان پر ہمیں کسی کو شک ہوتا ہے۔"

"صرف انسان؟" وہ ہولے سے مسکرائے۔ میں گڑبڑا گئی۔

"آف کورس، ہم انسانوں کی ہی تو بات کر رہے ہیں۔"

"مگر آپ نے گناہ کا ذکر کیا تو گناہ ایک اور مخلوق سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔" میں الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جانور، درندے، پرندے، حشرات الارض میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کر کے گھومتے گئے۔

"جنات!" میری خاموشی پر انہوں نے کہا تو سارے ہال میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ گئی۔

"جنات؟" میں ہولے سے بڑبڑائی۔

"جی ہاں، جنات ـــ اور یہ ایک ہسٹری ہے ان کو دہرانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں آپ کو کوئی ہارر اسٹوری نہیں سنانے لگا۔" ان کے چہرے کے تاثرات جیسے ہی سخت ہوئے آخری نشستوں پر بیٹھے سارے لڑکے تیر کی طرح سیدھے ہو بیٹھے۔ وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی [illegible] لے لی۔

"تو علیمہ داؤد اگر گناہ کی بات ہے تو کیوں نہ شیطان کا ذکر کیا جائے؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بول رہے تھے اور مجھے لگا میں نے اختلاف میں غلط [illegible] اٹھا لی ہے۔

"ہزاروں برس پہلے ایک جن ہوا کرتا تھا، وہ جنات کا باپ۔ اس کا نام عزازیل تھا۔ وہ فرشتوں کا سردار تھا۔ محترم تھا، مکرم تھا اس سے زیادہ عبادت گزار اور پارسا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے بڑا عبادت گزار تھا پھر کیا ہوا؟ آپ بتائیے علیمہ داؤد پھر کیا ہوا اس عزازیل کو آج آپ ابلیس کے نام سے یاد کرتی ہیں؟"

میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

"اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا ـــ یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا نہیں؟"

"جی ـــ جی۔"

"اس نے کیوں کیا وہ سب؟ کیوں وہ انسان سے حسد کا شکار ہوا؟ کیا اس کے تکبر بھرے انکار کی کوئی وجہ ہے انہیں ہرگز نہیں۔"

ہال میں سناٹا چھایا تھا۔ سب دم سادھے انہیں سن رہے تھے۔

"ابلیس نے جو بھی کیا وہ شیطان ہی کیا اور وہ آج بھی بہت سے انسانوں کو اپنے جیسا "ابلیس" صرف اس لیے بنانا چاہتا ہے کہ اللہ انسان سے محبت نہ کرے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ شک کا فائدہ اللہ نے ابلیس کو کیوں نہیں دیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ سے بڑھ کر رحمان کوئی نہیں ہے؟"

وہ مجھے دیکھ کر استفسار کر رہے تھے اور میں دم بخود سی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا تھا میری آواز بھی کہیں گم ہو گئی۔

"وہ اس لیے ڈیئر اسٹوڈنٹس کہ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پار کر لی جائے تو پھر اس شخص کو رعایت نہیں دی جا سکتی۔ بعض اصول ایسے ہوتے ہیں جن پر سمجھوتا ناممکن ہوتا ہے۔ سو اپنی زندگی میں اپنے اصول بنائیں کہ اگر کوئی انہیں توڑے تو آپ اس دشمن کو کوئی رعایت نہ دیں۔ عزازیل ہر کوئی بن سکتا ہے مگر جو عزازیل سے ابلیس بنے وہ بندگی کی جنت سے ابد کے لیے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کی کبھی واپسی نہیں ہوتی۔"

میں نے بے اختیار دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر دل میں دعا کی اور ایک دم پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔

"او کے کم آن اسٹوڈنٹس" وہ عجیب کرختگی سے رکھی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت پرانے پروفیسر، سر عثمان ریٹائر ہو رہے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار الوداعی ڈنر پارٹی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس پر تمام فیکلٹی ممبران اپنے ازواج کے ساتھ مدعو تھے۔ اسی شام میں نے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کی بیوی کو دیکھا۔

اس کا نام علینا تھا۔ وہ دراز قد اور بھورے گھنگریالے بالوں والی بے تحاشا حسین لڑکی تھی۔ جیسے موم کی گڑیا۔ رضا بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس تھے اور وہ ان کے ساتھ سیاہ اسٹائلش لباس میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کوئی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے؟ پارٹی میں کئی بار اسے رضا کا ہاتھ تھامے [illegible] وہ دونوں ایک ساتھ بے حد مکمل لگ رہے تھے کہ میں پوری تقریب انہیں دیکھتی رہی۔ لگا کہ ان کی بیوی ان ہی کی طرح بے حد مغرور اور شائستہ تھی البتہ میرا ان سے تعارف نہ ہو سکا کیونکہ میں رضا کے ارد گرد کے حلقے کے پیچھے چھپ جایا کرتی تھی۔

وہ تھیں ایک تصویر کھنچوانے کے لیے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اور کیمرا فلیش [illegible] کیمرے سے نکلتے فلیش کی روشنی میں ان کی جھلک اور بھی دمکنے لگی۔ کتنی ہی دیر بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی تصاویر لینے لگے اور وہ ریڈ کارپٹ پر فوٹو شوٹ کروانے والے اسٹار سیلیبریٹیز کے ساتھ ہر طرف کیمروں اور فلیش کی چکا چوند روشنیوں سے گھرے رہے۔ بہت دور سے ایک تصویر میں نے بھی لی تھی۔

اس رات میں اس تصویر کو دیکھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیوں؟

☆☆☆

کاریڈور میں اسٹوڈنٹس آ جا رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے خود کو گھسیٹتی آہستہ آہستہ ان کے آفس کے دروازے کی جانب بڑھنے لگی جس پر رضا حیات کے نام کی تختی لگی تھی۔

دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا [illegible]

[illegible] دروازہ کھلتا چلا گیا۔

ان کی کرسی خالی تھی۔ البتہ ایک کونے میں وہ جانماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ جس لیے میں نے دروازہ [illegible] وہ اسی لمحے سلام پھیر رہے تھے۔ میں احترام سے کھڑی ہو گئی۔

ان کے سلام پھیرنے تک میں چپ چاپ کھڑی رہی۔ وہ فارغ ہوئے تو سر اٹھایا۔ چہرے پر حیرت آ گئی۔

"میری ادبی [illegible] اسٹوڈنٹ [illegible] ابھی تک وہ دروازے پر کھڑی ہے۔ اس بات کا مجھے افسوس ہے۔ آئیں بیٹھیں۔" وہ جانماز تہہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور میں بے ارادہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"سوری پروفیسر! میں آپ کا [illegible]" وہ دوبارہ کرسی تک آئے۔ وہ اب گھوم کر میز کے پیچھے اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ رہے تھے۔ ان کا کوٹ کرسی کی پشت پر ٹنگا تھا اور وہ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے ہوئے بہت بے تکلف لگ رہے تھے۔

"کیا یہی کتاب [illegible] آپ نے؟" وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر صفحے پلٹنے لگے۔ کل کلاس کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک موضوع کے سمجھنے میں دشواری ہے تو انہوں نے فوراً مجھے ایک بجے اپنے آفس میں بلا لیا تھا۔

"تو اس میں کیا سمجھ نہیں آیا آپ کو؟" [illegible]

...ل کر اب وہ اس پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے بولے تھے۔

"تم یہاں سے آ گئے۔۔۔" میں آگے ہو کر آگئی ...رنے لگی۔ یہ مشکل اس وقت کے انہیں لگے ...تے ہیں۔ اور ساری باتیں میری سمجھ میں آگئیں۔

"آپ بتائیں چائے لیں گی یا کافی؟" کتاب ...کے انہوں نے ایک طرف رکھ دی۔

"دونوں نہیں۔"

"پھر کوئی تو لیں گی نا۔" وہ اٹھے اور ساتھ ہی ...ل اٹھا کے ایک کپ اٹھا کر رکھا اور ایک شیشے کے گلاس میں ڈال لیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ آپ کی وائف بہت اچھی ہیں پروفیسر۔" میں نے اورنج جوس کا ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔

"جانے بھی دو طیبہ وقار۔" انہوں نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔ میں چپ ہوگئی۔

"کیوں پروفیسر۔۔۔ کیا ہوا؟"

"اچھی شریف لڑکی وہ ہوتی ہے جو مرد کا سایہ ...ہے۔ اب آپ ہی دیکھئے آپ بالکل اپنی چھوٹی بچی کی طرح لگتی ہیں۔ اور مرد کہتے ہیں آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ مگر میری بیوی۔۔۔" ایک تلخ مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھری تھی۔ "میری بیوی میری نہیں ...۔" ان کا مجھے اپنی چھوٹی بہن کہنا مجھے محسوس کر گیا ...ان کی بیوی کا رویہ دوگی۔

"وہ ایسے کیوں کرتی ہیں؟"

"غرور۔۔۔ اپنی ذات کا زعم۔ دیکھو اپنے باپ کی ...کی اکلوتی، ایک عام سے پروفیسر سے ان کے بڑے ...نے بیٹی شادی کرنے کی تو وہ امیری پر تو بھی نہیں ...سوچی۔"

"آج میری تھی؟" میں اس وقت سب کچھ سوچنا چاہتی تھی سوائے اس کے کہ میں بہت پر سکون ہو رہی ہوں۔

"اوہوں۔۔۔ اورنج جوس کے علاوہ۔" ان کا دھیما چہرہ جوں وہ اسی سے پر تھا۔ میرا دل کٹنے لگا۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"بس کبھی طیبہ۔۔۔ میں اپنے لیے خود کچھ نہیں کر سکتا تو تم کیا کرو گی۔۔۔ بعض اوقات زندگی ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے۔ کچھ نہیں آتا کہ کس طرف جائیں۔ آگے یا پیچھے۔ ایسے میں اگر کوئی دل کا بوجھ ہلکا کر دے تو اچھا لگتا ہے۔ تم سے بات کر کے بھی اچھا لگا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔" پھر وہ میرے ساتھ ہلکی پھلکی دوسری باتیں کرنے لگے۔

وہ ساعتیں میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع بن گئیں۔ ان کے آفس سے نکلتے وقت میرے اردگرد میرا راستہ رنگ بدلتے بدلتے پکا تھا۔ میں اسی میں مگن تھی میں تیرتی رہی تھی۔ میں جاگتی آنکھوں سے ان کی ذات میں مکمل طور پر سماتی جا رہی تھی۔

اس روز میں نے مکمل دفعہ ایک پرچہ پڑھا تھا۔

البتہ یہ بات میں اس وقت نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو اماں رو رہی تھیں۔ ماموں آج بہت سی باتیں سنا کر گئے تھے۔ ان کی نظر پر قرض کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اور وہ اب گھر اور اماں کو سامان سمیت مکان سے باہر پھینکنے کی دھمکی دے کر گئے تھے۔

"کون سا طیبہ ہو گیا ہے کرامت بھائی کو۔" اماں کو اس چائے کی سے کی دلاری تھی۔ میرا دل بھی دکھ میں گھر سا گیا۔ عجب ویرانی کا عالم تھا۔ پریشانی کے باعث رات میں اماں کی حالت بگڑتی گئی۔ بخار نے انہیں پھر اپنی گرفت کے دورے پڑنے لگے۔

رات کے تیسرے پہر وہ بے حد مشکل وقت کچھ

سنبھلیں تو میں باہر برآمدے میں
آ بیٹھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پریشانی در پریشانی ہر مسئلے کے آخر میں اگر مجھے کوئی ایک شخص نظر آتا جو میری مدد کر سکتے تو وہ رضا حیات تھے۔ کیسے اور کیوں، میں نہیں جانتی تھی۔ صبح کے چار بجے بالآخر دل کے ہاتھوں ہار کر میں نے موبائل اٹھایا اور رضا کا نمبر ملایا جو انہوں نے مجھے آفس میں دیا تھا۔ دوسری گھنٹی پہ فون ریسیو کر لیا گیا۔

"حلیمہ داؤد نے اتنی جلدی مجھے کیسے یاد کر لیا؟" وہ اتنا ہشاش بشاش تھے کہ میں لمحے بھر کو اپنا مسئلہ بھول گئی۔

"آپ جاگ رہے تھے؟"

"ہاں، ابھی کچھ پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ تم بتاؤ، کیسی ہو؟" جواباً میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو دل بھر آیا۔ گلا رندھ گیا۔

"حلیمہ..... تم رو رہی ہو؟" وہ فکر مند ہو گئے مجھ سے آنسوؤں اور سسکیوں میں سب کہتی چلی گئی..... آخر میں وہ دھیرے سے ہنسے۔

"اتنی سی بات..... اور میں سمجھا کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔"

"ہے..... بالکل ہے..... اور یہ مسئلہ صبح تک حل ہو جائے گا۔" ویسے کدھر رہتے ہیں تمہارے ماموں؟" بے خیالی میں، میں نے ماموں کا ایڈریس اور نمبر دے دیا۔ پتا نہیں وہ ان کو کیسے سمجھائیں گے۔

"بس صبح تک میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اچھا بتاؤ تم نے رات سے کچھ کھایا پیا نہیں؟"

"نہیں۔"

"پھر میں ہولڈ کرتا ہوں، جاؤ کچن میں اور کچھ پلیٹ میں لے کر آؤ پھر باتیں کرتے ہیں۔"

"اچھا۔" میں نے فون رکھا اور مسکراتے ہوئے

ابھی۔ مجھے اپنے بھاری کندھے ہلکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس صبح ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ بچپن کی، اسکول کے زمانے کی، اپنی اپنی فیملیز کی، گھر والوں کی۔ مجھے وہ بھی اپنی طرح اکیلے اور اداس زمانے کے ستائے لگے تھے۔ میں بہت آہستہ ان کے بہت قریب آ گئی۔

اور پھر اس صبح وہ دو بندے نہیں آئے۔ شام کو ماموں نے اماں کو فون کیا کہ ان کو دو ماہ پیچھے بیٹے نے پیسے ادا کر دیے تھے۔ اماں حیران تھیں ان کو نہیں البتہ مجھے ضرور پتا تھا۔

"کس نے ادا کیے پیسے؟"

"ایک دوست نے مدد کی ہے۔ میں اسے لوٹا دوں گی۔"

"مگر....."

"آپ تم کہاں مطلع کیوں کی گئی ہیں؟" چپ ہو گئیں مگر اگلے روز جب میں نے رضا سے واپسی کی بات کی تو وہ "کرنے چھوڑو" کہہ کر بات ٹال گئے۔ میں نے اصرار کیا تو وہ فکرمند ہونے لگے۔

"اگر اب تم نے پیسوں کی کوئی بات کی تو میں سمجھوں گا کہ حلیمہ داؤد میری سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ نہیں ہے۔" اور پھر میں نے پیسوں کی کوئی بات نہیں کی مگر..... مگر واقعی..... دیکھیں میں نے واقعی پیسوں کی کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھی..... پھر بھی کیوں..... کیوں چند روز بعد مجھے علم ہوا کہ میں ان کی سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ نہیں ہوں؟ یا شاید نہیں رہی؟

کیوں نہیں رہی اور کب سے نہیں رہی؟

ہاں، تب سے جب فقرہ ایز ایم زندگی میں آ گئی۔

فقرہ..... وہ ہیرا جو تراشا نہیں، صرف ...

...ڈوز نے تو پھر بھی بہتر نہیں سکتا۔

☆☆☆

"فقرہ ایز ایم، ہائی ہیم..... مگر کلاس کو یہ تو بتائیں کہ فقرہ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" پوری کلاس کو سمجھایا تھا اور بہت سی نگاہیں رشک و حسد سے رضا حیات کی جانب کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ لیٹ ایڈمیشن تھی۔ دیر سے آنے والے مگر چھا جانے والوں میں سے تھی۔ کانچ سی لڑکی، بے حد گوری، شفاف جلد اور لانبی آنکھوں کی مالک۔ اس کے ... کریک کرتے تھے۔ سیدھے، سلکی سیاہ بال اور وہ انہیں سیٹ کرو بھی شانے پر آگے کو ڈال دیتی تھی۔ اس کا لباس بھی بہت جدید تراش خراش کا ہوتا تھا۔ آستین، جرابیں، کھلا گلا اور گردن سے لپٹا دوپٹا..... وہ بہت خوب صورت تھی، کسی اوس سے دھلے پھول کے مانند جسے چھوتے میلے ہونے کا خدشہ ہو۔

"فقرہ مینز دی ایڈلنٹ" وہ اپنی نازک لمبی گردن اٹھائے بولی تو رضا حیات دھیرے سے مسکرائے۔

"دی انڈنٹ..... جو ٹوٹتا نہیں صرف ہوتا ہے؟"

"اور اگر ایک دفعہ ٹوٹے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔" اسی انداز طریقے سے بولی۔

"آپ نے اتنا لیٹ ایڈمیشن کیوں لیا ہے؟" جواباً فقرہ نے نزاکت سے شانے اچکائے۔ اس کے شانے اچکانے کا انداز ایک منفرد انداز تھا۔

"موڈ نہیں تھا بس۔"

"نہیں، اچھا ہے کہ اب موڈ بن گیا تو کلاس میں فقرہ ایز ایم سے ہماری کلاس کی بیوٹی میں اضافہ ہے۔"

میں بری طرح چونکی مگر رضا حیات میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ فقرہ کی جانب متوجہ تھے آج

استاد کی قدر و عظمت

فاتح عالم سکندر ایک مرتبہ اپنے استاد ارسطو کے ساتھ گھنے جنگل سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑا برساتی نالا آ گیا۔ نالا بارش کی وجہ سے طغیانی پر آیا ہوا تھا۔ استاد اور شاگرد میں بحث ہونے لگی کہ خطرناک نالا پہلے کون پار کرے گا۔ سکندر بضد تھا کہ پہلے وہ جائے گا۔ آخر ارسطو نے اس کی بات مان لی۔ پہلے سکندر نے نالا پار کیا پھر ارسطو نے نالا عبور کر کے سکندر سے پوچھا۔ "کیا تم نے پہلے نالا پار کر کے میری بے عزتی نہیں کی؟" سکندر نے ادب سے جواب دیا۔ "نہیں استاد محترم میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ارسطو رہے گا تو ہزاروں سکندر تیار ہو سکتے ہیں لیکن سکندر ایک بھی ارسطو تیار نہیں کر سکتا۔"

مرسلہ: رفعت جبین رانی، کراچی

مجھے ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے کسی الہام کی ضرورت نہیں تھی۔ فقرہ پورے اہتمام سے ہماری تھی۔ مگر میں فیصلہ نہ کر سکی کہ مجھے فقرہ وہ کیسی لگی ہے یا بری لیکن یہ طے تھا کہ وہ میری جگہ لے رہی تھی۔

☆☆☆

کلاس کے دوران وہ لیکچر کو فوکس کرتی اور پیچھے سوال زیادہ کرتی۔ لیکچر کا زیادہ تر وقت رضا اس کے ہر سوال کا پورے تحمل سے جواب دینے میں گزار دیتے۔ وہ انہیں زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس کے بعض سوالوں میں کوئی سینس نہ ہوتا تھا۔

"بندر کی دم کیوں ہوتی ہے سر حیات؟" میں حیرانی سے سوچتی کہ اس بے تکے سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔

"کیونکہ بندر کو درخت سے لٹکنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی دم کو شاخوں پر رول کر کے لٹکتا ہے۔" رضا بہت

میرے، مسکراتے ہوئے ہر بات کی وجہ بتاتے تو میں انہیں داد دیے بغیر نہ رہ سکتی مگر پھر.....

"بندوں کا درختوں پر لٹکنا کیوں ضروری ہے، وہ ایسے ہی کیوں نہیں رہ سکتے؟"

"اُف....." میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی تھی۔ فضرہ سے سب ہی اب کوفت کھانے لگے تھے۔ اس کے سوال وقت کا زیاں تھے اور کچھ نہیں۔ یہ بات سب پہ عیاں تھی پھر بھی رضا سے جواب ضرور دیتے۔

اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس روز میں رضا کے آفس کس کام سے گئی تھی شاید کوئی اسائنمنٹ جمع کرانا تھا۔ دروازہ نیم وا دیکھ کر میں نے دھکیلا تو سامنے کا منظر عیاں ہوا۔ فضرہ، رضا کے مقابل کرسی پہ بہت بااعتماد بیٹھی تھی۔ کہنی میز پہ ٹکا کر ہتھیلی ٹھوڑی کے نیچے... وہ بلند آواز سے کسی بات پہ بحث کر رہی تھی۔ آہٹ پہ اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور پھر لب بھینچ لیے۔

"آیئے حلیمہ!" رضا نرمی سے مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فضرہ کی کرسی تک آئی۔ اس کے ساتھ ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ رضا نے اس خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

"بیٹھیں۔" فضرہ ایک دم کھڑی ہوئی، ایک تیکھی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولی۔

"آپ مصروف ہیں تو میں اپنا سوال پھر کلیئر کروں گی۔"

"ارے نہیں فضرہ، آپ بیٹھیں، میں نے حلیمہ سے پوچھنا ہے....."

"رہنے دیں، جا رہی ہوں میں۔" ایک کڑی نگاہ مجھ پر ڈال کر اس نے میز پر رکھا پرس اٹھایا اور کھٹ کھٹ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔

"ناسمجھ ہے، بچی ہے، تم برا مت ماننا۔ بیٹھو۔"

"نہیں پروفیسر، بس یہ اسائنمنٹ....." میں نے کاغذوں کا پلندہ ان کی طرف بڑھایا۔

"رکھ دو..... میں دیکھ لیتا ہوں۔ چائے پیو گی یا کافی؟"

"کچھ نہیں، مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔" میں [illegible] شکستہ قدموں سے پلٹ گئی۔ میں کیوں [illegible] اور کس کے لیے۔ مجھے لگا آپ رضا پر ایک [illegible] لگتا تھا۔ ان کی زندگی کی مکمل تصویر میں میری [illegible] جگہ نہیں تھی۔ آہستگی سے میں نے ان کے کمرے کا دروازہ بند کیا تو دیکھا فضرہ دیوار سے ٹیک لگائے سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی ہے۔ میں سر جھکائے آگے بڑھنے لگی تو وہ ایک دم میرے ساتھ چل دی۔

"کیا ہے تم میں حلیمہ داؤد کہ رضا حیات [illegible] وقت تمہاری باتیں ہی کرتے ہیں؟"

میں ٹھٹک کر اس کی جانب پلٹی۔ وہ عجیب [illegible] ہوئی نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"حلیمہ ہے، حلیمہ وہ ہے، انہیں حلیمہ سے آگے اور پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے جب تک تم ہو، وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھیں گے۔" اس کے لہجے میں اتنا کرب اور دکھ تھا [illegible] میں دنگ رہ گئی۔

"فضرہ! میرا اور تمہارا کیا مقابلہ؟"

"ہے نا! تبھی تو وہ میری ہر شے کو تم سے کمتر [illegible] کرتے ہیں۔ میں کیا کروں کہ میں تم جیسی بن جاؤں حلیمہ؟" پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے اپنے جیسا بنا دو حلیمہ داؤد تاکہ وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیں۔" مجھے لگا اس کی [illegible] میں لی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پہ [illegible]

[illegible] تھا کہ میں ٹک ٹک اسے دیکھے گئی۔ زندگی [illegible] وہ مجھے بری نہیں لگی تھی۔

"اچھا! میرے ہاتھ چھوڑو، لوگ دیکھ رہے ہیں، آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" میں آگے چل دی وہ [illegible] نازک مزاج، شاہانہ سی لڑکی سر جھکائے [illegible] پیچھے ہو لی۔

اس ہیرے کو توڑنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ [illegible] سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی روح، دل اور [illegible] سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ وہ وہ [illegible] نہیں تھی جو کلاس میں آتی تھی۔ وہ رضا کو زچ کرنے [illegible] سوال نہیں کرتی تھی۔ وہ وقت ضائع کرنے [illegible] بحثیں نہیں کرتی تھی۔ وہ تو صرف توجہ کی طالب تھی۔ اسے رضا کی توجہ چاہیے تھی۔ اسے صرف [illegible] کی اپنے لیے کہی گئی چند باتیں چاہیے تھیں۔ وہ اپنا [illegible] کے روپ میں حلیمہ داؤد کا پرتو بھی [illegible] یہ بات میں [illegible] بتا سکی۔

اس کے والدین آسٹریلیا میں تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے پاکستان آئی تھی۔ پڑھنے کے لیے عموماً لوگ پاکستان سے آسٹریلیا جاتے ہیں مگر فضرہ کا ہر کام الٹا تھا۔ [illegible] والدین سے دور رہنے کے لیے ادھر اپنی [illegible] کے پاس رہنے آئی تھی۔ پڑھائی کا تو بس بہانہ تھا۔ [illegible] اس کے والدین کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی اور [illegible] کا امکان تھا۔ وہ ان کی روز روز کی ٹک ٹک [illegible] ذہنی مریض بن گئی تھی اور پھر ادھر ارحل تھا۔ اس کا [illegible] اور اس کے عشق میں پاگل..... مگر فضرہ کو اس [illegible] کی حد تک کوفت تھی۔ وہ سارا وقت ارحل [illegible] بھاگنے کی کوشش کرتی مگر اس کی آتش عشق [illegible] شادی پہ اصرار سے [illegible] ارحل ہر بات پہ اس کی منت کرتا اور وہ [illegible] کرتی رہتی۔ اب تو اس کا گھر جانے کا دل ہی نہیں [illegible] وہ توجہ کی طالب تھی اور من چاہی توجہ اسے صرف ایک ہی شخص دے سکتا تھا۔ رضا حیات خان.....

"مجھے ہر طرف رضا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہر دیوار، ہر کھڑکی، ہر درخت پہ میں آسمان کو دیکھوں تو بھی وہ نظر آتا ہے۔ ایک دن میں ان کو کلاس میں نہ دیکھوں تو میری سانس بند ہونے لگتی ہے..... میں کیا کروں حلیمہ؟" اور مجھے جو لگتا تھا کہ اس مرض عشق میں، میں اکیلی ہی مبتلا ہوں تو غلط لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔

اس روز ہم دونوں دوست بن گئے۔ ایک انوکھا عجیب سا جوڑ..... مگر خیر جوڑ تو بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان ایک ہی اشتراک تھا اور کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا تھا؟

☆☆☆

رات کو فضرہ کی کال آ گئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"ارحل نے کچھ کہا ہے کیا؟" میں پریشان ہو گئی۔

"بھاڑ میں گیا ارحل..... میری زندگی میں ارحل سے زیادہ مسائل ہیں۔" وہ چلائی تو میں نے گہری سانس لی۔

"پھر.....؟"

"پروفیسر رضا..... وہ میری کال نہیں اٹینڈ کر رہے۔"

"تو وہ کیوں کریں گے؟"

"اگر تمہاری کال اٹینڈ نہیں کریں تو تم رو دو گی نہیں؟"

"نہیں۔" حالانکہ مجھے پتا تھا کہ میں بھی رو دوں گی مگر گھٹ گھٹ کے اس کی طرح باآواز بلند نہیں۔

"تمہیں ان سے ویسی محبت نہیں ہے پھر بھی

لگتے ہے۔"

"محبت کے پیمانے اپنی مرضی سے مت بھرو فقرہ۔ تم کسی کے دل کا حال کیا جانو۔"

"پر وہ تمہیں مجھ سے زیادہ محبت دیتے ہیں، زیادہ عزت دیتے ہیں، تمہیں چھوٹی بہن بولتے ہیں اور میں تو کہیں نہیں ہوں۔"

"بہن بولیں، بیٹی بولیں یا اسٹوڈنٹ۔۔۔ ہم دونوں کا رشتہ برابر ہے۔" میں اسے سمجھانے لگی مگر وہ ضدی لڑکی کہاں سمجھتی تھی۔

"پتا ہے حلیمہ۔۔۔ میری امی میرے ابو سے جب بہت لڑتی تھیں تو انہیں کہتیں کہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور تب میں سوچتی شاید واقعی ایسا ہے مگر اب رضا سے مل کر مجھے لگتا ہے کہ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔ کچھ مرد رضا جیسے بھی ہوتے ہیں۔ عورت کو احترام اور عزت دینے والے، نگاہیں جھکا کر رکھنے والے، مضبوط کردار کے سچے مرد۔"

"پاگل!" میرے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ ابھر گئی۔ رضا ایسے ہی تھے۔ نگاہیں جھکا کر بات کرنے والے۔ عموماً جب وہ میرے ساتھ مخاطب ہوتے تو وہ مجھے دیکھ بھی نہیں رہے ہوتے تھے۔

"لیکن پتا نہیں کیوں حلیمہ۔۔۔ میں ان کی بیوی سے بہت جیلس ہوتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔" فون رکھنے سے قبل اس نے کہا تو میں بے اختیار چونک گئی تھی۔

☆☆☆

بہت دن بعد رضا کا فون آیا تو میں بہت خوش ہوئی۔

"ہمیں کیسے یاد کر لیا، پروفیسر؟"

"کر تو لیا۔" وہ مجھ سے بولے۔

"گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں، تم سناؤ، کچھ کمپیٹیشن میں حصہ لے رہی ہو؟"

"میں کہاں اچھا بول سکتی ہوں، پروفیسر؟"

"کوشش تو کر سکتی ہو۔"

"جانے دیں، بلکہ فقرہ کا نام دے دیں، وہ اچھا بول سکتی ہے۔"

"یہ تم دونوں کی دوستی کیسے ہوئی؟" وہ حیران ہوئے۔

"بس ہو گئی۔۔۔ آپ کو برا لگا؟"

"نہیں۔۔۔ فقرہ کچھ چالاک ہے، اسے دیا کرو مگر۔۔۔" وہ جیسے لے ٹھہر کر جھجکے۔ "تمہاری [illegible] فقرہ میں بہت ذہین ہے۔" انہوں نے [illegible] فقرہ دوسروں سے اچھی ہے میں چونکی۔

"کس چیز کی ذہین ہے؟"

"بس ہو گی۔"

"کیا کہیں ہے؟"

"بس جی جھوٹ بولنے کی۔۔۔ باتیں گھڑنے کی۔"

"ارسل!" میں شاکڈ رہ گئی۔ "آپ کو کیسے پتا؟"

"مجھے پتا ہے، اس نے مجھے اپنے کزن کے بارے میں بتایا تھا۔"

"ارسل؟"

"ہاں ارسل۔" وہ مجھ سے بولے۔

"کیوں؟ ارسل کیا اس کو اس طرح [illegible] کرتے جیسے وہ ہوئی کرتی ہے؟"

"حلیمہ ڈارلنگ، تم بہت سیدھی ہو۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "تم نے اس کی ارسل والی بات یقین کر لیا؟"

"کیوں نہ کرتی؟"

"حلیمہ۔۔۔ ارسل کوئی نہیں ہے۔ فقرہ کا کوئی خالہ زاد کزن نہیں ہے۔ اس کی خالہ تو [illegible] ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" میں ششدر رہ گئی۔

"اس کے اندر باتیں گھڑنے کی بہت صلاحیت ہے، ذرا احتیاط کرنا۔ وہ بس توجہ لینے کے لیے ایسا کرتی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے فون بند کیا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ چند لمحوں بعد ہی فون دوبارہ بجا۔ میں [illegible] فقرہ کا فون۔

"ہاں فقرہ؟" میں نے فون کان سے لگایا۔

"تمہارا نمبر بزی تھا۔" [illegible] "ان کا نمبر بھی بزی تھا۔ تم لوگ آپس میں بات کر رہے تھے کیا؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے فقرہ؟" بلا وجہ اس کی شدت پسندی کے مجھے اس کی فکر رہتی تھی۔ اگر اس نے ارسل کو گھڑا تھا تو [illegible] بھولی تھی تو میں بھی اتنی ہی بھولی تھی۔

"فرق یہ پڑتا ہے کہ مجھے کال کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے مگر تمہارے لیے وقت نکل آتا ہے۔" وہ حسد کا [illegible] نہیں تھی، اسے صرف احساس محرومی تھا۔

"انہوں نے صرف تقریری مقابلے کا پوچھنے کے لیے فون [illegible]"

"دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔" وہ اندازے کی درستی [illegible] بولی اور کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

چند ساعتیں گزریں تو پھر اس کی کال آ گئی۔

"حلیمہ۔۔۔" وہ رو رہی تھی۔ "میں پاگل ہونے لگی ہوں۔"

"خود کو سنبھالو فقرہ۔۔۔ وہ تمہارے ٹیچر ہیں، تمہارے لیے کتنا کر سکتے ہیں؟"

"بس ایک نظر۔۔۔ ہر دن میں ایک نظر کی تڑپ [illegible] مجھے۔" وہ اپنے آپ میں نہیں تھی، اس کی تڑپ [illegible] زیادہ تھی۔

سالگرہ کی بہار

بہار آئی گلاب جیسے
ہماری آنکھوں کے خواب جیسے
کھلی کلیوں کو چوم کر
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
وہ ساعتیں وہ تمام جذبے
جو وقت کی دھول میں اٹ گئے تھے
[illegible]
[illegible]
ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہیں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہماری آنکھوں کے شعلے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]، کراچی

"تم ان کے بارے میں دوسرے طریقے سے مت سوچو۔"

"نہیں سوچتی۔۔۔ اور وہ ایسے بندے ہیں بھی نہیں۔ وہ تو نظر بھر کر بھی مجھے نہیں دیکھتے۔ کوئی مرد اتنا

پار سا بھی ہو سکتا ہے؟"

"وہ تو ہیں نا۔"

"ہاں!" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"پتا ہے حلیمہ، اس روز میں ان کے آفس گئی تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھ گئی اور ان کو نماز پڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ سجدے میں جھک گئے تو میں سانس روکے ان کے اٹھنے کا انتظار کیے گئی۔ ان کی نماز اتنی آہستہ، دھیمی اور خوب صورت تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔"

"سو تو ہے۔" اور پھر ہم دونوں گھنٹوں رضا کی باتیں کیا کرتے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لائق کوئی اور موضوع رہا ہی نہیں تھا۔ ہمارے واحد پوائنٹ نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اور پھر میں اور قطرہ الگ ہو ہی نہ سکے۔

☆☆☆

مجھے شدید ٹائیفائڈ نے آن گھیرا اور میں کئی دن تک بستر پر رہی۔ وہ دنوں کا ایک اہم چپٹر پر رہا تھا اور میں ہم بے ہوشی کی حالت سے کبھی نکل پاتی اور کبھی نہیں۔

شاید مجھے یونیورسٹی سے ناغہ کیے چھٹا روز تھا جب قطرہ مجھے دیکھنے آئی۔

"دیکھو تو میرے ساتھ کون ہے؟" اس کی آواز میں خوشی کی رمق تھی۔ میں نے بہ دقت آنکھیں کھولیں تو دیکھا رضا حیات چوکھٹ میں کھڑے تھے۔

"پروفیسر!" میرے لب بمشکل ہلے، آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

"اب رضا آئے ہیں نا تمہیں دیکھنے، اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔" وہ بے تکلفی سے میرے سرہانے آ بیٹھی پھر رضا کے لیے ساتھ ہی کرسی کھینچی۔

"آپ بیٹھیں نا رضا۔" وہ اسی طرح ان کو نام سے پکارتی تھی۔

"کیسی ہیں آپ حلیمہ؟ ہم سب کو پریشان ہی کر دیا۔" وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھے، مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"بس!" میرا گلا رندھ گیا۔ میں ٹھیک سے بول بھی نہیں سکی۔

"اللہ آپ کو صحت دے گا۔ یہ بیماری کچھ نہیں سوائے اس کے کہ پاک کرنے والی ہے۔"

"ٹھیک ہے پروفیسر۔" میری آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"رضا... آپ تو اچھے طبیب ہیں۔ اسے عبادت گزار ہیں، کچھ پڑھ کر پھونکیں نا حلیمہ پر کہ ٹھیک ہو جائے۔"

"اتنا بھی ٹھیک نہیں۔" وہ جھینپ گئے۔

"ہیں نا... حلیمہ تمہیں پتا ہے رضا چھ سال کی عمر سے تہجد پڑھ رہے ہیں اور آج تک ان کی کوئی تہجد نہیں چھوٹی۔"

"جانے دو قطرہ۔" وہ شرمندہ ہو گئے اور میں سوچنے لگی کہ جس شخص کی ستائیس سال تک کوئی تہجد نہیں چھوٹی ہو، اس کا مقام اللہ کے نزدیک کیا ہو گا؟ میرا دل رعب سے بھرنے لگا۔

پھر وہ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر لب سے کوئی آیت پڑھنے لگے۔ ان کا عربی لب و لہجہ بہت خوب صورت تھا۔ چند لمحے بعد وہ خاموش ہوئے اور مجھ پر دم کر دیا۔

"اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" جاتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

رات تک وہ ٹائیفائڈ جو پہلے اترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا، یوں غائب ہوا جیسے کبھی چڑھا ہی نہ تھا۔ اگلی صبح میں ہشاش بشاش یونیورسٹی میں تھی۔ مگر مجھے حیرانی نہیں تھی۔

جس شخص نے ستائیس سال اللہ کی عبادت

ہو... اللہ اس کی بات کیوں ٹالتا حلیمہ؟" اور میں اس سے متفق تھی۔

☆☆☆

ان دنوں قطرہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک چمک اور انوکھی مسکراہٹ ہر وقت رہتی۔ اب وہ رضا کو زچ کرنے والے سوال بھی نہیں کرتی تھی بلکہ ہر دم میرے ساتھ رضا کی باتیں کرتی۔ ان کو کھانے میں یہ پسند ہے۔ ان کو پرفیوم کی یہ خوشبو اچھی لگتی ہے۔ ان کا پسندیدہ لباس یہ ہے۔ وہ قرآن کے حافظ ہیں اور ہر وہ بات جو میں نہیں جانتی تھی قطرہ کو معلوم ہوتی تھی۔ رضا کے بارے میں وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔ گو کہ ارسل کے قصے اب بھی اس کی زبان پر ہوتے تھے لیکن اب وہ بہت کم ہی وہ قصے سناتی۔ رضا اس کی ہر بات کا آغاز و اختتام ہوتے تھے۔

شاید رضا اس کی ذہنی حالت اور وجہ اگی بھری طبیعت کو کچھ سمجھنے لگے تھے۔ کبھی اس کو زیادہ وقت دینے لگے۔ وہ اکثر کلاس آف ہونے کے بعد بھی گھنٹوں رضا کے آفس میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ قطرہ گھر لیٹ جانے لگی تھی اور جب گھر جاتی تو بھی رضا کو فون پر مصروف رکھتی۔ پڑھائی پر سے اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ وہ تو امتحان قریب ہونے پر دھیان دیتی نہ اسائنمنٹس پر وہ تو اب لیکچر نوٹ کرنے کا تکلف بھی نہ کرتی تھی۔ رضا کی کلاس میں قلم ہونٹوں میں دبائے ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے یک ٹک رضا کو دیکھے جاتی۔ دوسری کلاسز بنک کر دیتی۔

پہلے میں ہفتے میں ایک بار رضا کے آفس چلی جایا کرتی تھی کوئی موضوع سمجھنا ہوتا یا ایسے ہی دل بھاری ہو جاتا تو ان سے بات کر کے اچھا لگتا تھا۔ مگر اب سے وہ قطرہ کو زیادہ وقت دینے لگے میرے لیے وقت کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کلاس میں لیکچر کے علاوہ وہ مہینہ گزر جاتا اور میں شاید ہی ان کی شکل دیکھ پاتی۔

میں نے بھی پھر انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اس سے آگے کہاں جا سکتا تھا بھلا؟ مجھے یہ بات سمجھ آ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے میں ان کی طرف دیکھتی۔ میرے دل میں ایک امید جاگ اٹھی تھی کہ اگر رضا میرے لیے دعا کر دیں تو میری مشکل ٹھیک ہو سکتی ہے۔ بچھڑے شہزادی بچوں کی طرح بھاگتے اور وہ دونوں کو میرا دل چاہنے لگا تھا۔

مگر ایک اذیت بھی تھی۔ عشق لاحاصل... کو عمر بھر جانے کا یہ عشق لاحاصل مجھے میری روح کھنچنے لگی تھی۔ میں رضا کی محبت میں قطرہ کی طرح ڈوب چکی تھی مگر اس کا انجام کیا ہونا تھا؟ اس روز کی آخری لکیر کو عمر تھی؟ لیکن اپنے بارے میں اب میں کہاں سوچتی تھی۔ میں تو قطرہ اور رضا کی قلم کی خاموش تماشائی بن چکی تھی۔

☆☆☆

چند ہفتے مزید گزرے تو مجھے قطرہ میں ذرا فرق محسوس ہوا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوتی تو وہ پکارے جانے پر بری طرح چونک جاتی۔ کبھی اداس بات بے بات رونے لگ جاتی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر بہنے کو تیار ہوتے۔

"قطرہ تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"ہوں... کچھ نہیں... کچھ نہیں..." وہ پھیکا سا مسکرا کر کہتی تو میں مطمئن نہ ہوتی۔

"کوئی مسئلہ ہے قطرہ؟"

"نہیں تو..." اس کی رنگت اب زرد رہنے لگی تھی۔ میں بہت پوچھتی مگر وہ چھپا جاتی۔

پھر ایک روز وہ ہوا جو مجھے ساری زندگی اذیت

دیتا رہے گا۔ میں جو قطرہ کے لاکھ چھپانے پر بھی کریدتی رہی۔ ایک روز سب کچھ ایک دم سے جان گئی اور وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا۔

☆☆☆

"پروفیسر رضا کہتے ہیں کہ میں ان کی چھوٹی بہنوں کی طرح ہوں حلیمہ..... کتنا معتبر کر دیتا ہے یہ رشتہ آپ کو۔ تب میں انہیں رضا بھائی بلانے لگی ہوں۔ وہ خالی رضا بلانے پر ٹوکتے ہیں۔" ہم دونوں لائبریری کے باہر بنچوں پر بیٹھے تھے۔ جب وہ اور خود بتانے لگی۔ اور اسے درمیان اس موضوع کے علاوہ کسی دوسرے پر کبھی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

"پتا ہے ایک بات ہے۔"

"مگر میں ان کی بیوی سے بہت جیلس ہوتی ہوں حلیمہ۔"

"میں بات سوچو رضا کے بارے میں، اتنا مہرد ایک سے نہیں ہوتے۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے اور رضا بھائی جیسا تو کوئی نہیں ہے۔ جس شخص نے دس برس تک اللہ کی عبادت کی ہو اس کو تو سب معاف ہے نا؟"

"ہاں، انہیں، پتا نہیں۔" میں نے ناسمجھی میں سر ہلایا۔ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

"اچھا چلو کینٹین چلتے ہیں۔" وہ فائل اٹھا کر کھڑی ہوئی تو ایک چھوٹا سا تہ شدہ کاغذ اس کی فائل سے گرا اور میرے قدموں میں آن ٹھہرا۔

وہ اپنی دھن میں آگے بڑھ گئی۔ ویسے بھی وہ ذرا غائب دماغ رہنے لگی تھی۔ آگے پیچھے کا ہوش اسے نہیں رہتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھایا اور اسے پکارا۔

"قطرہ..." مگر وہ دور نکل چکی تھی۔

میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں شاید اس کا کوئی اسائنمنٹ ہو میں چیک کر لوں گی یہی سوچ کر میں نے وہ کاغذ کھولا تھا۔

وہ ایک پرچہ کاغذ تھا۔ میں اسے پڑھتی گئی بار بار پڑھتی گئی یہاں تک کہ میرے وجود سے جان نکل گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا لیکن پھر میں نے ہمت مجتمع کی اور کاغذ اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

"قطرہ۔" میں نے اسے جالیا۔ "کینٹین نہیں، لائبریری چلو۔"

"کیوں؟" وہ کسی خیال سے چونکی۔

"چلو نا۔" میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے زبردستی لائبریری کی طرف لے آئی۔

اندر سناٹا چھایا تھا۔ ہم دونوں کتابوں کے ایک ریک کے پاس جا کھڑے ہوئے اور مجھے پتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے کونے میں رکھی ایک کتاب اٹھائی اور قطرہ کی طرف بڑھی۔

"ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتانا۔" میں نے بائیں ہاتھ میں اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا تھا کہ وہ بھاگ نہ پائے۔

"ہاں بولو۔" وہ حیران سی کھڑی تھی۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

"کیا؟" اس نے اچک کر مجھے دیکھا۔

"تم کس کے بچے کو جنم دینے والی ہو؟ تمہاری پریگنینسی رپورٹس پازیٹو آئی ہیں۔"

"نہیں؟" اس کا رنگ لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔

بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکالنا چاہا مگر میں نے گرفت اور مضبوط کر دی۔

"بولو.... یہ بچہ کس کا ہے؟" میں سرخ آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"ن.... نہیں...." اس کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ بے جان لاش کی طرح لرزتی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"نام بتاؤ مجھے اس کا۔ کون ہے وہ؟"

وہ بار بار لب کھولتی..... پھر بند کر لیتی۔

"قطرہ... جواب دو۔" میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"وہ..... ارسل کا..." بمشکل وہ بول پائی۔

"جھوٹ! تمہارا ارسل نام کا کوئی کزن نہیں ہے۔"

"نہیں....." اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

"یہ قرآن ہے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ یہ بچہ کس کا ہے، کس کے ساتھ کیا ہے تم نے گناہ۔" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب پر رکھا تو وہ ایک دم وحشت زدہ ہو کر تڑپنے لگی۔ وہ محض ایک عام سی کتاب تھی مگر قطرہ اسے قرآن سمجھ کر لرز اٹھی تھی۔

"نہیں..... نہیں....." وہ خود کو چھڑانا چاہتی تھی مگر چھڑا نہیں پا رہی تھی۔

"نام بتاؤ قطرہ.... بس نام۔" وہ رونے لگ گئی۔ میری منتیں کرنے لگی کہ میں اسے چھوڑ دوں مگر جب میری گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکی تو ایک دم اس کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

"میں نے جان بوجھ کر نہیں..... اس نے مجھے مجبور کیا..... زبردستی۔"

"کون ہے وہ؟" اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں اس کا جواب جان گئی تھی۔

"رضا..... رضا حیات..... خان۔" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بے دم سی پیچھے دیوار سے جا لگی اور وحشت سے پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ شاید خود بے یقین تھی۔

میری بیساکھی زمین پر گر گئی۔ میں خود بھی آہستہ سے فرش پر آ بیٹھی اور پھر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے رونے لگی۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ میرا پارس پتھر جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔

لوگ میرے اردگرد اکٹھے ہونے لگے اور میں روتی گئی۔ کوئی وجہ پوچھتا اور کوئی تسلی دیتا۔ سب حیران پریشان تھے کہ یہ بدصورت لنگڑی لڑکی یوں زمین پر بیٹھی کیوں رو رہی ہے۔

"شاید اس کا کوئی مر گیا ہے۔" کسی نے دور ہی سے تبصرہ کیا۔ بات ٹھیک تھی میرا عزیز ترین مر گیا تھا۔ میں یونہی بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں کا ہجوم چھٹتا گیا اور میں لائبریری میں تنہا رہ گئی۔ تب میں اٹھی اور وہ کتاب اٹھائی اور اپنی بیساکھی کے سہارے خود کو گھسیٹتی باہر جانے لگی۔

گھر تک کا سفر اس روز بہت طویل، بہت کٹھن لگ رہا تھا۔ میں آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سامنے دیکھتی، بے خودی میں چلتی جا رہی تھی۔ وہ ساحر تھا..... اس کے ایک اشارے پر بل کھاتی رسیاں سانپوں کی طرح رینگنے لگتی تھیں۔ مگر ساحر اور معجزے میں یہی تو فرق ہوتا ہے، ساحر کی رسیاں سانپوں کے مانند دوڑتی ہوئی لگتی ہیں مگر سانپ بن نہیں جاتیں۔ جلد یا بدیر جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور معجزہ عصا کو واقعی اژدہا بنا دیا کرتا ہے۔ ایسا فرقان عطا کرتا ہے کہ ہر شے یوں الگ ہو جاتی ہے جیسے سمندر میں اکٹھا بہتا کڑوا اور میٹھا پانی جو کبھی ایک دوسرے میں داخل نہیں ہو پاتا۔

میں اندھیرے میں اور بے تحاشا پانی پر چلتی جا رہی تھی۔ میری بیساکھی کی ٹک ٹک مضطرب سی آوازوں میں گم ہو رہی تھی۔

کتنا عرصہ ہوا میں نے ہر مسئلے کے حل کے لیے رضا کا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی تو مجھے ان سے عشق ہے مگر نہیں..... میں نے تو انہیں اپنا دیا تھا.....

ہمارا خدا بنایا تھا۔ صدیوں پہلے جب نیل کو پار کر کے اسرائیل کی اولاد ایک بستی سے گزری تھی تو ان ناخلف لوگوں نے بستی والوں کے جھوٹے معبودوں کی عبادت دیکھ کر موسیٰ سے کہا تھا کہ ہمیں بھی ایک ایسا الٰہ (معبود) بنا دو۔ میں نے بھی یہی کیا تھا جب رضا حیات کو دیکھا تو دل نے خواہش کی کہ میں بھی اس پہ پجاری ہو سکوں۔۔۔

پھر جب موسیٰ کوہ طور سے دن نے اور بنی اسرائیل پر وحشت طاری ہو گئی تو انہوں نے کہا کہ موسیٰ کا دل اس سے گم ہو چکا ہے۔ مجھ پر بھی وحشت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے بھی لاشعوری طور پہ یہ سمجھا تھا کہ میری مدد کرنے والا میرا اللہ مجھ سے کھو گیا ہے اور تب میں نے بچھڑا بنا لیا۔ ایسے ہی اسرائیل نے بنایا۔ ایک سونے کا چمکتا دمکتا، بے حد خوب صورت بچھڑا۔

مجھے اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نہیں جانتی مگر میرا حساب شروع ہو چکا تھا کوئی میرے اندر بار بار مجھ سے یہ پوچھتا رہتا تھا کہ کہاں ہے تمہارا وہ مددگار بچھڑا خدا؟ پکارو رضا حیات کو۔ وہ آئے اور تمہیں اس اذیت سے نکالے جس میں فقرہ کے اعتراف نے تمہیں دھکیل دیا ہے۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی مگر وہ بچھڑے جو مصیبت کی گھڑی میں میرا مشکل کشا بن کر سامنے آ جاتا تھا آج مجھ سے گم ہو چکا تھا۔

میرا خود ساختہ الٰہ بس گیا تھا۔

☆☆☆

"میرا قصور نہیں تھا۔۔۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ تعلق مذہب اور معاشرے کی پابندیوں سے بالا ہے۔" وہ درخت سے ٹیک لگائے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ "انہوں نے مجھے مطمئن کیا اور میں مطمئن ہو گئی۔ تم جانتی ہو وہ لفظوں کے ساحر ہیں۔ ان کو انکار کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔"

میں ویران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فقرہ کا چہرہ بیماری کی حد تک زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ وہ واقعی کمزور اور اجڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں بتایا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ لاش بن چکی ہے۔

"علیہ میں انہیں کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کر لیں مگر وہ نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ شادی کی بات ٹال دیتے ہیں۔ وہ بات ادھر ادھر گھما دیتے ہیں۔ کیا وہ مجھ سے شادی کر لیں گے؟"

"شاید نہیں۔۔۔ ایک پر سکون جھیل کے ہوتے ہوئے وہ کنوؤں پہ رسک کیوں لیں گے جبکہ انہیں بغیر شادی کے ہی سب مل رہا ہے۔"

"علیہ؟" اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ "جب سے میری رپورٹس آئی ہیں میں ان سے نہیں ملی۔ میں فون پہ بھی زور دیتی ہوں شادی پر۔"

"اور اب تم ان سے کبھی نہیں ملو گی۔۔۔ سنا تم نے؟" میرے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چند روز گزرے اور اس نے اپنی خالہ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ میرے گھر آ کر رہنے لگی۔ اماں کو اعتراض ہوا مگر میں نے انہیں بتایا کہ شوہر نے طلاق دے دی ہے، وہ بے چاری کدھر جائے؟ اور جب اماں کو میری زبانی علم ہوا کہ ماموں کو کرنے کی رقم دینے والی فقرہ ہی تھی تو ان کے سارے اعتراض اور شکوک و شبہات دور ہو گئے۔

میرا ایمان ٹوٹ چکا تھا اور مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کبھی جڑ بھی پائے گا یا نہیں۔

زرد چہرہ اور نڈھال وجود لیے وہ بیٹھی تو بڑی خلاؤں میں گھورتی رہتی یا پھر بے آواز آنسوؤں سے روتی رہتی۔ زندگی فقرہ کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

رضا اب اس کی کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی آواز سننے کو ترس گئی تھی۔ مر رہی تھی مگر وہ بہت مصروف تھے۔ آج کل وہ ایک ماڈلنگ کرنے آنے والی لڑکی روما قاسم کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ مگر اسے نیک، شریف اور پارسا پروفیسر کے ساتھ ظاہر ہے روما قاسم صرف اس لیے دیکھی جاتی تھی کیونکہ وہ اسے آنے والے الیکشن کی تیاری کروا رہے تھے اور اسی لیے اکثر جب روما ان کے آفس میں ہوتی تو دروازہ اندر سے لاک ہوتا تھا۔

"میں جانتی ہوں وہ لڑکیوں کو اپنے آفس میں بلا کر کیا کرتے ہیں۔" فقرہ وہ رو پڑی تھی۔

"میں سب جانتی ہوں مگر میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔" وہ روتی بلکتی رہتی اور میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے جاتی۔ دنیا صرف اس کی لٹ گئی تھی۔

☆☆☆

"سر ہم نے سنا ہے کہ آپ قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ پلیز ہمیں بھی سنائیے۔" روما قاسم بچوں کی طرح چہک رہی تھی اور رضا جو کتاب کھول کر لیکچر شروع کرنے ہی والے تھے ذرا سا جھینپ گئے۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"پلیز سر......"

"پلیز پروفیسر سنا دیں نا!"

"سر رضا پلیز......"

بہت ساری منت بھری آوازیں گونجیں اور لڑکیوں نے دونوں سے سر دھننا شروع کر دیا تو وہ گہری سانس لے کر مائیک کے قریب ہو گئے۔

میں پلک جھپکے بغیر ان نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی ملال، کوئی شرمندگی، کوئی احساس گناہ، کیا کچھ بھی تھا ادھر؟ وہ ذرا سا گنگنا کر تلاوت پڑھنے لگے۔

ان کی خوب صورت آواز کا سحر پورے ماحول پر چھانے لگا۔ بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ہر شخص اس لحن میں مدہوش ہو گیا تھا سوائے میرے۔ میں بہت غور سے ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ کہیں کوئی احساس گناہ، کوئی تو قلم تھا یا نہیں؟ کیا واقعی انسان کے اعمال اس کی پیشانی پر نہیں لکھے جاتے؟

وہ اتنے ہی پرسکون، نیک اور پارسا لگ رہے تھے جتنا پہلے لگتے تھے۔ یہی تو فرق ہے مرد اور عورت میں۔ مرد صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے اور میری آنکھیں اب دھوکے کی عادی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

فقرہ اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھی تھی۔

"اگر وہ میری منتوں ترلوں کے باوجود مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوئے تو اس طرح کیسے ہوں گے؟"

"تم کوشش تو کرو، تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ کبھی جا کر ان کی بیوی کو سب بتا دوں گی۔"

"میں تو غصے میں کہتی تھی۔ بھلا ان کی بیوی میرا یقین کیوں کرے گی؟" وہ بجھی بجھی سی بولی تھی۔

"ان کی بیوی تمہارا یقین کیوں نہیں کرے گی؟ یہ بھی رضا نے ڈالا ہے تمہارے ذہن میں۔ تم پر اعتماد ہو کر ان سے بات کرو۔ وہ اس دھمکی پر ضرور ڈریں گے۔" اسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر میں اسے سمجھانے لگی۔ بہت دیر بعد اسے میری بات سمجھ میں آئی۔

"تمہارا سیل فون سے کال اٹینڈ نہیں کرتے تو تم میرے پی ٹی سی ایل سے کال کرو۔" فون کا ریسیور کریڈل سے اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں تھمایا اور اسے اکیلا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں برآمدے میں تنہا بیٹھ گئی۔ سامنے میز پر ایکسٹینشن دھرا تھا۔ چند لمحے میں سوچتی رہی پھر آہستہ سے ریسیور اٹھایا۔ میرے اندر موجود رضا حیات کی محبت میں روتی ہوئی لڑکی مسلسل فقرہ کو ابھار رہی تھی۔ شک کے باعث مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے سماعت ان کی گفتگو کی طرف لگا دی۔ غیر اخلاقی حرکت تھی مگر شاید اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔

وہ کہہ رہے تھے۔

"کس نمبر سے کال کر رہی ہو فقرہ؟"

"علینہ کے لینڈ لائن سے۔ میں آج کل اس کے پاس رہنے گئی ہوں۔" وہ چند ثانیے کو خاموش ہو گئے۔

"رضا! مجھ سے شادی کر لیں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔" (تم برباد ہو چکی ہو فقرہ!) میں نے دل میں سوچا تھا۔

"فقرہ! کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"آپ مجھ سے شادی کر لیں۔" وہ میری ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔

"ساری زندگی پڑی ہے شادی کے لیے۔ ابھی کوئی اور بات کرو۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے تو میں آپ کی وائف کو سب کچھ بتا دوں گی۔ یہ بھی کہ میں آپ کے بچے کی......"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔" وہ تیزی سے بولے۔

"پھر مجھ سے شادی کر لیں۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔

رضا چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر دھیرے سے بولے۔

"تم نے علینہ کو تو کچھ نہیں بتایا؟"

"بے فکر رہیں۔ آپ کے اس ڈارک سیکرٹ سے کوئی واقف نہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"ٹھیک ہے، ہم کل شادی کر رہے ہیں۔ کل رات آٹھ بجے تم علینہ کے گھر پہنچ جانا۔ وہاں مرسڈیز کے شوروم کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جانا۔ میں تمہیں وہیں سے پک کر لوں گا۔ وہاں سے ہم میرے دوست کے گھر جائیں گے جہاں نکاح ہو گا۔ ٹھیک؟"

"جی...... جی۔" وہ گنگ سی ہو گئی۔

"لیکن اگر تم نے علینہ سمیت کسی کو بھی بتایا کہ کل رات تم مجھ سے ملنے آ رہی ہو تو شادی تو چھوڑو میں تم سے بات بھی نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ دس منٹ بعد جب میں واپس کمرے میں آئی تو فقرہ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

"وہ مجھ سے شادی کریں گے۔"

"کب؟"

"کچھ دن تک؟" وہ مسکرا کر ٹال گئی اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ آج بھی رضا حیات کی داسی تھی۔ ان کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والی ان کے فرمان کے مطابق مجھ سے جھوٹ بولنے والی۔

☆☆☆

"مجھے خالہ کی طرف چھوڑ دو۔ میرے پیپرز آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

اگلی شام جب میں نے اسے دانستہ بتایا کہ میں بازار کی طرف جا رہی ہوں تو وہ فوراً اچھل کر تیار ہو گئی۔

ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر اس نے گلابی شیفون کا دوپٹہ پھیلا کر لے لیا تھا۔ بال کھول کر دائیں شانے پر آگے کو ڈالے اور آنکھوں کو کاجل سے دہکایا۔ کانوں میں لٹکتے آویزوں میں پہلے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

میں نے ٹیکسی میں اسے اس کی خالہ کے گھر کے

قریب مارکیٹ میں چھوڑو۔

"تم جاؤ۔ میں آگے خود چلی جاؤں گی۔" وہ اتر کر بولی تو میں نے سر ہلا دیا پھر میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی والا ایک راؤنڈ لے کر واپس ادھر آیا تو فروہ دوسری ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔

میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کی طرف بڑھا دیا۔

"اس لڑکی کا پیچھا کرو۔ یہ بلیو ایریا جا رہی ہے۔" کافی فاصلے سے اس کے تعاقب کے بعد میں فریسکو بیکری کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں میں تھی وہاں اندھیرا تھا۔ فروہ مجھ سے دور سرمئی چہرے کے شو روم کے سامنے منتظر کھڑی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی مگر میں اسے بخوبی دیکھ رہی تھی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی آٹھ بج کر ایک منٹ تھا اور تبھی میں نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ وہ کار مخالف سمت سے بہت تیزی سے آ رہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آخری حد تک روشن تھیں۔ اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔

"فروہ!" میرے لب پھڑپھڑائے۔ بے اختیار میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

تیز رفتار کار زن سے فروہ کے قریب آئی۔ فروہ اور میں نے ایک ساتھ ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تھا اور وہ چہرہ دیکھ کر فروہ کی آنکھوں کی جوت جل اٹھی تھی۔ وہ بے اختیار چند قدم آگے سڑک پر آئی۔

"نہیں... فروہ..." میں چیخنا چاہتی تھی مگر میری آواز حلق میں دم توڑ گئی۔ فروہ اسی طرح سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ تیز رفتار کار فراٹے بھرتی ہوئی اس کے سامنے آئی اور فروہ کو ایک زوردار ٹکر مار کر آگے بڑھ گئی۔

ایک دل خراش چیخ کے ساتھ فروہ لہرا کر پیچھے گری۔ میں نے چلاتے ہوئے بھاگنا چاہا مگر جیسا کبھی گر گئی۔ میں خود وہاں سے دوڑ میں پڑ جا گری۔

وہاں فروہ خون میں لت پت گری وحشیانہ انداز میں چلا رہی تھی اس کے ارد گرد لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ بہ مشکل اپنی بیساکھی سنبھال کر میں لنگڑاتے ہوئے اس تک پہنچی پاس لوگوں کے ہجوم میں سے بہ وقت راستہ بنا کر میں نے دیکھا۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کا بے دم وجود خون میں نہایا تھا اور اس کی نگاہیں بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر گئے سے زیادہ وہ شاید اس آخری لمحے رضا حیات کے چہرے پر سچائی کو دیکھ کر بے یقین ہوئی تھی۔

دور ایمبولینس کا سائرن بجنے لگا... مگر میں جانتی تھی کہ اب دیر ہو چکی تھی۔ میرا ہیرا چکنا چور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

فروہ مر گئی اور اپنے پیچھے بہت سے آنسو چھوڑ گئی۔ رضا حیات کو اس کی موت کا کلاس میں پتا چلا تھا۔ وہ بے حد حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے وہیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور قرآن کی تلاوت کے بعد ایک رقت آمیز دعا کروائی۔ آخر میں ان کی اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر فروہ کی موت کے تیسرے روز انہوں نے فروہ کی یاد میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام میں فروہ کی ایک خوب صورت تصویر پیچھے اسٹیج پر آویزاں کی گئی اور فروہ کے تمام جاننے والوں نے اس کے متعلق تاثرات بیان کیے۔

جب مجھے بلایا گیا تو میں نے ایک ویران نگاہ سب پر ڈال کر بس اتنا کہا۔

"فروہ وہ ہیرا تھی جسے جوہری تراش نہ سکا۔ جوہری نے ایسی ضرب لگائی کہ وہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ ہیرا سب سے سخت کو کہتے ہیں ہوتا ہے۔ اگر ٹوٹ جائے تو جڑ نہیں سکتا۔ وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔"

چند روز گزرے تھے کہ میں نے سنا رضا حیات نے اپنا ٹرانسفر کروا لیا ہے۔ وہ یہاں سے چلے گئے اور اپنے پیچھے اپنے چاہنے والوں کو اداس چھوڑ گئے۔

میں نہ ہی پولیس اسٹیشن گئی۔ نہ ہی اس ہٹ اینڈ رن ایکسیڈنٹ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ فروہ کے قاتل کو زیادہ سے زیادہ پھانسی مل جاتی؟ ایسے تو وہ آگے جہاں اپنے گناہ سے بری ہو جاتے۔ میں نے اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ قتل ان کے نامہ اعمال کا داغ بنا تو کیا نہیں تھا۔ سو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہوئے میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور انہیں توبہ کا موقع بھی نہ دے۔ یہ دنیا ابلیسوں کے لیے سزا کی جگہ نہیں ہے۔

☆☆☆

کلاس میں پن ڈراپ سائلنس تھا۔ سب دم بخود دھڑکتے دلوں سے سر ہاشم آفندی کو سن رہے تھے۔ وہ ہمارے سائیکالوجی کے نئے پروفیسر تھے۔ ینگ، اسمارٹ، ہینڈسم، حاضر جواب اور مہربان۔ وہ سب کچھ تھے۔ کوئی سحر تھا ان کے پاس کہ چند ہی دنوں میں ساری کلاس ان کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔ ان کی گرویدہ ہو گئی تھی۔

"کتنے اچھے ہیں ہاشم آفندی..." کلاس کے بعد جب میں اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی تو میری کلاس فیلو فاطمہ یوسف نے آ گھیرا تھا۔

"ہوں گے۔" میں نے فائل میں صفحے ترتیب سے لگاتے ہوئے سرسری سا کہا۔

"بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جلیب اتنے نیک اور مہربان... جانتی ہو ان کا تعلق خاندان سے ہے۔ بلکہ برصغیر میں اسلام کو متعارف ان کے بزرگوں نے ہی کروایا تھا۔"

"میں نے انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے

فاطمہ۔ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ انسان وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں۔" میں بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاطمہ نے خفگی سے مجھے دیکھا۔

"سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔"

"ہاں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے مگر فارمولا سب پر ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔ جو محرم ہے، وہ مرد آپ کے لیے اچھا ہے اور جو محرم نہیں ہے، وہ چاہے آپ کو جس رشتے سے بھی پکارے وہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہو سکتا۔ جو محرم نہیں، اس سے تنہائی میں ملنے کی اجازت میرے رب نے نہیں دی۔ چاہے وہ تنہائی ٹیلی فون تک محدود ہو یا کسی پروفیسر کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی حد تک۔ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے فاطمہ مگر فارمولا سب پر ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔" ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میں پلٹ گئی۔ میری بیساکھی کی ٹک ٹک خالی کلاس روم میں گونجنے لگی۔ میں لنگڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں جانتی ہوں کہ پیچھے کھڑی فاطمہ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی مگر شاید آپ کو آ گئی ہو۔ مجھے قدرت کا یہ اصول اس وقت سمجھ آیا تھا جب میں فروہ کو کھو چکی تھی۔ ہاں میرا بچھڑا رضا حیات تھا۔ وہ جس کے صرف خیال نے ہی مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے اللہ سے دور کر رہا تھا۔

میں نے اس سونے کے بچھڑے کو توڑ کر جلا کر نیل کے پانیوں میں بہا دیا ہے اور اب میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کا بھی کوئی ایسا بچھڑا ہے جس نے آپ کو باندھ رکھا ہے اور آپ کو اللہ سے دور کر دیا ہے؟ اگر ہے تو اسے ابھی توڑ دیں۔ نصیحت پھر بعد میں آپ کے پاس نہیں آئے گی... بعد میں صرف عذاب آتا ہے۔